

ناظم حکمت

منتخب نظمیں

پیش لفظ

ناظم حکمت کو ترکی میں اولین جدید شاعر اور بیسویں صدی کے عظیم بین الاقوامی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اُس کی شاعری کے دنیا کی پچاس سے زیادہ مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ وہ ۱۹۰۲ میں سالونیکا میں، جہاں اس کے والد سفارتی ملازمت میں تھے، پیدا ہوا اور اس کی پرورش استنبول میں ہوئی۔ اس کی والدہ آرٹس تھیں۔ اور اس کے دادا، جو پاشا ہوا کرتے تھے، شاعر تھے۔ اس کی پہلی کتاب ۱۹۱۷ میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۲ میں روسی انقلاب کے وعدوں کے زیر اثر وہ سرحد پار کر کے ماسکو چلا گیا۔ چھ برس بعد ۱۹۲۸ میں جب وہ عام معافی نامے کی بدولت ترکی واپس آیا تو وہاں اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔ لہذا خفیہ پولیس نے اس پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ اگلے دس میں سے پانچ برس اس نے مختلف فرضی مقدمات میں جیل جاتے اور سماعتیں بھگتتے ہوئے گزارے۔ لیکن اسی دوران میں، ۱۹۲۹ سے لے کر ۱۹۳۶ تک، اس نے نو کتابیں شائع کیں کی، جن میں سے پانچ نظموں کے مجموعے تھے۔ اس کی شاعری نے ترکی میں انقلاب برپا کر دیا۔ عثمانی سلطنت کی تمام شعری روایات کو بالائے طاق رکھ کر اس نے آزاد شاعری کی بنیاد رکھی اور شاعری میں عام بول چال کی زبان کو مروج کیا۔ اس طرزِ تحریر نے ادب کے میدان میں ایک عظیم جدید شاعر کی حیثیت سے اس کی جگہ متعین کی۔

جنوری ۱۹۳۸ میں ترکی کی فوج کو بغاوت پر اکسانے کی سازش میں اسے ۲۸ برس کی سزا ہوئی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ فوج کے ارکان اس کی نظمیں، خاص طور پر ”شیخ بدرالدین کارزمیہ“ پڑھ رہے تھے جس سے انہیں بغاوت کی ترغیب مل سکتی تھی۔ پابلونرودا نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ناظم حکمت کو دی گئی سزائیں جہنم کی سزاؤں سے بھی بدتر اور کڑی تھیں اور وہ بہ مشکل ان سے جاں بروسکا۔ قید میں اس کی

شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ اور اس کا لہجہ اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ خطوں میں اپنے خاندان اور دوستوں کو اپنی شعری تخلیقات بھجواتا رہا اور عرصہ دراز تک اس کی شاعری قلمی نسخوں کی شکل میں لوگوں میں گردش کرتی رہی۔

۱۹۴۹ میں پال روڈسن، پابلو پکا سوا اور ژاں پال سارتر جیسے مفکروں اور ادیبوں نے مل کر حکمت کی رہائی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی اور مہم چلائی۔ ۱۹۵۰ میں اسے عالمی امن کا انعام دیا گیا، اسی سال اپنے دل کے عارضے کے باوجود، اس نے اٹھارہ دن کی بھوک ہڑتال کی اور جب ترکی کی پہلی جمہوری حکومت کی تنظیم ہوئی تو اس کی رہائی عمل میں آئی۔ لیکن ایک سال کے اندر اندر اس پر پھر نگرانی اور جو رستم پورے جوش و خروش سے شروع ہو گیا۔ اس وقت کے حالات بیان کرتے ہوئے سیمون دوبوار لکھتی ہے:

جیل سے پھٹنے کے بعد اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے قتل کرنے کے لئے اس پر دو حملے کئے گئے (کارو میں، استنبول کی تنگ گلیوں میں)۔ اور پھر پچاس برس کی عمر میں اُسے روس کے محاذ پر جبری فوج سروس کے لئے چن لیا گیا۔ وہ باسپورس کے راستے سے، ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ میں، ایک طوفانی رات میں وہاں سے فرار ہو گیا۔ بہت تگ و دو کے بعد بالآخر رومانیہ کے ایک مال بردار جہاز کے کارکنوں نے اسے جہاز پر چڑھا لیا۔ خستہ و نیم جان وہ کپتان کے کیمین میں داخل ہوا۔ وہاں سامنے دیوار پر اس کی اپنی بہت بڑی تصویر آویزاں تھی جس کے نیچے درج تھا: ”ناظم حکمت کو رہا کیا جائے“۔ سب سے مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ وہ پچھلے ایک برس سے رہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ا

اسے ماسکو لے جایا گیا جہاں شہر کے مضافات میں پیرے دلکینو میں اسے ادیبوں کی کالونی میں رہنے کو جگہ دی گئی۔ ترکی کی حکومت نے اس کی بیوی اور شیرخوار بچے کو اس سے جاکر ملنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ وہ دوبارہ ترکی ہی واپس آسکا۔ زندگی کے آخری دس برسوں میں اس نے پولینڈ کی شہریت اختیار کر لی اور مشرقی یورپ اور بہت سے دوسرے ملکوں کا سفر کیا۔ دل کے دورے کے باعث ماسکو میں جون ۱۹۶۳ میں اس کا انتقال ہوا۔

والٹ وٹ مین کی طرح ناظم حکمت اپنی، اپنے ملک اور دنیا کی باتیں ایک ہی سانس میں کرتا نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

۱۔ Simone de Beauvoir, *Force of Circumstance*, translated by

Richard Howard (New York: Putnam's 1965) ۳۹۰-۳۹۱۔

میں نظمیں لکھنی چاہتا ہوں جو میرے اور ایک اور شخص کے بارے میں ہوں لیکن جن کا رُخ
لاکھوں لوگوں کی جانب ہو۔ میں نظمیں لکھنی چاہتا ہوں جو ایک سیب کے بارے میں ہوں، جو
جُتی ہوئی زمین کے بارے میں ہوں، جو قید سے رہائی پانے والے کسی شخص کی ذہنی کیفیت
کے بارے میں ہوں، جو بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والے عوام الناس کے بارے میں
ہوں، جو ایک شخص کے دل ٹوٹنے کی کیفیت کا بیان ہوں۔ میں موت کے خوف کے بارے
میں اور اس سے مکمل بے خوفی پر نظمیں لکھنی چاہتا ہوں۔ ۲

اس کی شاعری ایک ہی وقت میں ذاتی بھی ہے اور عوامی بھی۔ وہ خود آگاہی یا خود پسندی کا شکار
ہوئے بغیر ایک ہی لمحے میں واقعات کی سچائی اور اپنے جذبات کی درستی کی توثیق کرتا نظر آتا ہے۔ شاعری
میں اس کی اپنی موجودگی جو کبھی شوخی کا رنگ لیے ہوتی ہے، کبھی رجائیت پسندی کا اور کبھی بچوں جیسے انبساط
کی حامل ہوتی ہے، اس کی شاعری کو کشادگی بخشی ہے، اسے اور عوامی بناتی ہے، اور اسے سماجی اور فنی
تغییرات کی نگرانی میں رکھتی ہے۔

ناظم حکمت کو اپنے نظریہ فن و حیات کو سنبھالے رکھنے کی بڑی کٹری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس نے
اٹھارہ برس ترکی کی مختلف جیلوں میں اور زندگی کے آخری تیرہ سال جلاوطنی میں کاٹے، لیکن نہ اس نے اپنے
نظریہ فن کو اپنی زندگی سے علیحدہ کیا، نہ اپنے نظریات کو قربان، نہ ہی اپنے ذاتی کردار کو کسی طرح ملوث کیا۔
اپنی شاعری میں وہ خلوص اور دیانت کی بہترین مثال بن کر ابھرتا ہے۔ ٹھیک ہے، وہ کہتا نظر آتا ہے (خاص
طور پر اپنی نظموں ”چند ہدایات اُن کے لیے جنھیں جیل میں وقت کا ٹٹا ہو“ اور ”بس یہ یوں ہے“ میں)، کوئی
نظریہ ایسا نہیں ہوتا جس کے بچاؤ کے لیے کوئی قیمت نہ ادا کرنی پڑے۔ اصل بات یہ ہے کہ ”ہار نہ مانی
جائے، اور زیادہ نہ سہی، دشمن کا دل جلانے کی خاطر ہی سہی، کم از کم ایک دن مزید زندہ رہا جائے۔“ اس کا
نظریہ حیات و فن ایک ہی وقت میں مارکسی اور صوفیانہ، اور تاریخی اور ماورائے تاریخ نظر آتا ہے۔ شاعری
اس کی نظر میں اتنی اہم ہے کہ زندگی اور موت کا سوال بن جاتی ہے۔ — مترجم]

Mutlu Konuk, Introduction in *Poems of Nazim Hikmat*, ۲

translated by Randy Blessing and Mutlu Konuk (New York:

-xiii, Persea Books, 1994)

دل کاروگ

میرا آدھا دل اگر یہاں ہے
تو باقی کا آدھا چین میں ہے
فوج کے ہم راہ جو پیلے دریا کی سمت
اڑی جا رہی ہے۔

اور صبح، ڈاکٹر
ہر صبح سورج طلوع ہوتے وقت، یونان میں
میرے دل پر گولیاں برسادی جاتی ہیں
اور ہر رات، ڈاکٹر،

جب قیدی نیند میں ہوتے ہیں اور بیمار خانہ بند ہوتا ہے
میرا دل استنبول میں ایک پرانے، خستہ اور ویران گھر
کے سامنے جا رکتا ہے۔

لیکن اب دس برس گزرنے کے بعد
میں اپنے نادار لوگوں کو اس سرخ سیب
کے علاوہ کیا دے سکتا ہوں؟
صرف ایک سرخ سیب، جو میرا دل ہے۔
اور یہ وہ وجہ ہے، ڈاکٹر،

جس کے باعث مجھے دل کاروگ لگا ہے۔
تمباکو، یا قید، یا شریانوں کے تصلب کے سبب نہیں۔
میں اس رات کو ان سلاخوں کے عقب سے دیکھتا ہوں
اور اپنے سینے پر بوجھ کے باوصف

میرادل دور دراز ستاروں کے ہم راہ دھڑکتا ہے۔

(اپریل ۱۹۴۸)

چند ہدایات ان کے لیے جنھیں جیل میں وقت کا ٹٹا ہو

پھانسی کے پھندے سے جھولنے کی بجائے

اگر تمھیں جیل میں پھینک دیا جائے

اس لیے کہ تم دنیا میں

اپنے ملک اور لوگوں سے وابستہ امیدیں ترک نہیں کرتے،

اوتھیں دس یا پندرہ سال اُس وقت میں سے

جو تمھارے پاس بچ رہا ہے،

علیحدہ کرنے پڑ جائیں،

تو یہ کہنا تمھیں واجب نہیں:

بہتر ہوتا اگر میں پھانسی کے پھندے سے

جھنڈے کی طرح جھول رہا ہوتا۔

تم مضبوطی سے قدم جمائے رکھو گے اور جیو گے۔

یہ زیادہ خوش کن بات نہ سہی

لیکن تمھارا مقدس فرض ہے کہ ایک دن مزید زندہ رہو،

دشمن کا دل جلانے کی خاطر ہی سہی۔

تمھارے وجود کا ایک حصہ شاید اندر موجود رہے

کنوئیں کی تہ میں گڑے پتھر کی طرح،

لیکن دوسرے حصے کو دنیا کے جوش و خروش میں
 یوں مشغول رہنا ہے کہ تمہیں لگتا رہے
 کہ اگر تم باہر ہوتے تو چالیس دن کی دوری پر
 کوئی پتا بھی ہلنا تو تم وہاں اندر کانپ جاتے۔
 اندر رہتے ہوئے خطوں کا منتظر رہنا،
 اُداس گیت گانا،
 اور چھت کو گھورتے ہوئے ساری رات جاگنا،
 پر لطف سہی مگر خطرناک ہوتا ہے،
 بہتر ہے کہ ایک شیو سے دوسرے تک
 اپنے چہرے کو دیکھتے رہو، اور
 اپنی عمر کو فراموش کر دو۔
 جوؤں اور بہار کے موسم کی راتوں سے خبردار رہو،
 اور ہمیشہ یاد رکھو کہ
 تمہیں روٹی کا آخری ٹکڑا تک تناول کرنا ہے۔
 ہاں، دل کھول کر بننے سے بھی گریز نہ کرو۔
 کیوں کہ کسے علم ہے کہ وہ عورت
 جس کے عشق میں تم گرفتار تھے
 تمہارے عشق میں گرفتار نہ رہے،
 یہ مت کہو کہ یہ بڑی بات نہیں،
 اندر رہنے والے کسی شخص کے لئے یہ ایسے ہی ہے
 جیسے کوئی ہری شاخ یک لخت ٹوٹ جائے۔
 اندر گلابوں اور بانگوں کے خیال میں غرق رہنا

بے فائدہ ہے۔

لیکن سمندروں اور پہاڑوں کے بارے میں سوچنا نہایت مناسب۔

رُکے بغیر پڑھتے اور لکھتے رہو،

میں تمہیں کپڑا بننے اور آئینے بنانے کا مشورہ بھی دے سکتا ہوں

یعنی، یہ ناممکن نہیں کہ تم

دس، پندرہ یا زیادہ برس اندر گزراؤ،

بس اتنا خیال رکھو

کہ تمہاری چھاتی میں

بائیں جانب جو موتی موجود ہے

اس کی تابناکی میں کمی نہیں آنی چاہیے۔

(مئی ۱۹۴۹)

میراجنازہ

کیا میراجنازہ میرے صحن سے اٹھے گا؟

تیسری منزل سے تم مجھے نیچے کیسے اتارو گے؟

میرا تابوت ایلویٹر میں نہیں سمائے گا،

اور سیڑھیاں از حد تنگ ہیں۔

سورج شاید صحن میں گھٹنوں گھٹنوں کھڑا ہو اور کبوتر،

ہو سکتا ہے برف بچوں کی چیخ و پکار سے بھر پور ہو،

ہو سکتا ہے بارش اپنے گیلیے اسفالٹ کے ساتھ موجود ہو

اور کچرے کے ڈبے صحن میں ہمیشہ کی طرح رکھے ہوں۔

اگر جیسے یہاں رواج ہے، مجھے کھلے چہرے کے ساتھ
 کسی ٹرک میں رکھا جائے گا، ہو سکتا ہے
 کوئی کبوتر میرے ماتھے پر کچھ گرا دے۔ یہ نیک شگون ہوگا،
 بینڈ باجے ساتھ ہوں یا نہ ہوں بچے میرے قریب آجائیں گے
 وہ مردوں کے بارے میں تجسس رکھتے ہیں۔

ہمارے باورچی خانے کی کھڑکی مجھے روانہ ہوتے دیکھے گی
 ہماری بالکنی، ڈوری پر لٹکے کپڑوں سمیت، مجھے خدا حافظ کہے گی
 تم شاید کبھی نہ جان سکو میں اس صحن میں کتنا خوش رہا ہوں
 میرے ہمسایوں، میں تمہیں طول عمر کی دعا دیتا ہوں۔

(ماسکو، اپریل ۱۹۶۳)

نویں سال گرہ

گھٹنوں تک آتی برف والی رات
 میری ابتلا شروع ہوئی
 رات کے کھانے کی میز سے کھینچ کر
 مجھے پولیس کار میں دھکیلا گیا،
 ایک ریل گاڑی میں لاد گیا،
 پھر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔
 تین دن اس ابتلا کی نویں سال گرہ سے اوپر
 گزر گئے ہیں۔

برآمدے میں ایک شخص
اسٹریچر پر کمر کے بل دراز،
منہ کھولے، مرنے کے قریب ہے
آہنی زنجیروں کا دکھ اس کے چہرے پر کندہ ہے۔

میں دور افتادگی کے بارے میں سوچ رہا ہوں
بد حال کرنے والی اور مکمل،
جیسے جنونی لوگوں اور مرزوں کی ہوتی ہے۔
شروع میں، پہلے چھتر دنوں میں
بند دروازوں کی خاموش عداوت تھی
پھر سات ہفتے تک مال بردار جہاز کا گودام۔
میں پھر بھی شکست خوردہ نہ ہوا،
میرا سر میرے پہلو میں کسی دوسرے شخص کا تھا

ان میں سے بہت سوں کی صورتیں میرے ذہن سے محو ہو گئی ہیں
صرف ایک بہت لمبی نوکیلی ناک یاد ہے
تاہم کتنی بار میرے سامنے وہ صف آرا ہوئے۔
جب بھی میرے جرم کی سماعت شروع ہوئی انہیں ایک ہی فکر تھی
وہ کیسے مجھے مرعوب کر سکیں گے۔
وہ یہ نہیں کر سکے

انسانوں کی بجائے وہ میرے لیے بے جان اشیاء تھے
جیسے دیواروں پر نصب گھڑیاں ہوں
جو احمق اور متکبر لگتے ہیں۔

اور ہتھ کڑیاں یا بیڑیاں وغیرہ،
جو غم زدہ اور قابل رحم ہوتی ہیں۔

سڑکوں اور گھروں سے خالی ایک شہر
بے حساب امیدیں، بے پناہ اندوہ
لامتناہی فاصلے

چار پایوں والی مخلوق میں سے صرف بلیاں

میں ممنوعات کی دنیا کا باشندہ ہوں
تمہارے محبوب عارض کی خوشبو سونگھنا
میرے لئے ممنوع ہے

تمہارے بچوں کے ہم راہ میز پر طعام
ممنوع ہے

لوہے کی جالی یا پہرے دار کی غیر موجودگی میں
تمہارے بھائی یا والدہ کے ساتھ گفتگو
ممنوع ہے

تم نے جو خط تحریر کیا ہو، اسے بند کرنا
یا وہ خط وصول کرنا جو مہر بند ہو،

ممنوع ہے

بہی بند کرنا جب تم سوچکی ہو

ممنوع ہے

تنہیٰ نزدیکی بازی لگانا

ممنوع ہے

اور یہ نہیں کہ وہ ممنوع نہیں ہے
 ماسوا اس بات کے جو تم اپنے دل میں چھپا سکتی ہو
 یا ہاتھ میں لے سکتی ہو
 جیسے عشق کرنا اور سوچنا اور سمجھنا۔

برآمدے میں اسٹریچر پر لیٹا ہوا آدمی
 مر چکا ہے،
 وہ اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔
 اب نہ کوئی امید ہے نہ غم،
 نہ روٹی نہ پانی،
 نہ آزادی نہ قید،
 نہ عورتوں کی خواہش، نہ محافظ، نہ کھٹل،
 نہ بلیاں جو اسے بیٹھ کر گھورتی رہیں۔
 وہ سارا جھگڑا تمام ہو گیا ہے،
 لیکن میرا جھگڑا ابھی موجود ہے۔
 میرا نامردانہ طیش مجھے کھائے جا رہا ہے
 اور صبح سے
 میرے جگر میں بھی درد ہے . . .

(۲۰ جنوری ۱۹۴۶)

ریستوراں کی خادمہ

برلن کے اسٹوریاریستوران کی ایک خادمہ
 ہیرے جیسی ایک لڑکی تھی۔
 وہ اپنے بھرے ہوئے طبق کے اوپر سے مجھے دیکھ کر
 مسکرایا کرتی تھی
 وہ میرے ملک کی اُن لڑکیوں کی طرح تھی
 جو مجھ سے جھن چکا ہے
 کبھی کبھی اُس کی آنکھوں کے تلے حلقے ہوا کرتے تھے
 معلوم نہیں کیوں؟
 مجھے کبھی اُس کی منتخب میزوں پر بیٹھنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔
 وہ کبھی میری کسی منتخب میز پر نہیں بیٹھ پایا۔
 وہ بزرگ آدمی تھا،
 اور یقیناً بیمار بھی تھا کیوں کہ وہ خاص خوراک کھاتا تھا۔
 میرے چہرے کو وہ افسردگی سے دیکھتا رہتا،
 لیکن وہ المانی نہیں بول سکتا تھا۔
 تین ماہ تک وہ روزانہ تین وقت کی غذا
 کے لئے آتا رہا۔
 پھر اچانک غائب ہو گیا
 شاید وہ اپنے ملک واپس چلا گیا ہو
 یا واپسی سے قبل ہی مر گیا ہو۔

(۲۳ جولائی مئی ۱۹۵۹)

”تم“

تم میدان ہو

اور میں ٹریکٹر ہوں،

تم کاغذ ہو

اور میں ٹائپ رائٹر،

اے میری عورت، میرے بیٹے کی ماں!

تم ایک گیت ہو

اور میں گٹار۔

میں وہ گرم اور مرطوب رات ہوں

مغرب کی ہوا جسے لے کر آتی ہے۔

تم پانی کے کنارے کنارے چلتی ہوئی عورت ہو

جو سامنے کی جانب روشنیوں کو دیکھتی ہے۔

میں پانی ہوں

اور تم اسے پینے والوں میں سے ہو۔

میں سڑک پر جاتا ہوا راہ رو ہوں،

اور تم وہ ہو جو کھڑکی کھول کر

مجھے اپنی جانب بلاتی ہو۔

تم چین ہو،

اور میں ماؤزے تنگ کی فوج،

تم چودہ برس کی فلی پین کی دوشیزہ ہو

جسے میں نے امریکی ملاحوں کے شکنجے سے بچایا ہوتا ہے۔

تم اناطولیہ میں پہاڑوں میں گھرا ہوا گاؤں ہو،
تم میرا شہر ہو،

جو دنیا میں سب سے خوب صورت اور سب سے ناشاد ہے۔
تم مدد کے لئے پکار ہو، میرا مطلب ہے تم میرا ملک ہو،
اور تمہاری جانب لپکتے ہوئے قدم میرے ہیں۔

(۱۹۵۹)

وصیت نامہ

ساتھیو، اگر مجھے وہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو
میرا مطلب ہے اگر میں آزادی پانے سے قبل ہی دنیا ہی سے اٹھ جاؤں
تو مجھے دور لے جانا
اور اناطولیہ کے کسی گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔
مزدور عثمان کو، جسے حسن بے کے حکم سے گولی مار دی گئی تھی
میرے ایک جانب، اور
شہید عائشہ کو جس نے رائی کے کھیت میں جنم دیا
اور چالیس دنوں کے اندر اندر مر گئی،
میری دوسری جانب دفن کرنا۔

صبح کی روشنی میں

ٹریکٹر اور گیت قبرستان کے نیچے سے گزرتے رہیں گے
نئے لوگ اور سوختہ پٹرول کی بو،

اور مشترکہ ملکیت میں کھیتوں اورندیوں میں پانی ہوگا
وہاں نہ خشک سالی کا ڈر ہوگا نہ پولیس کا۔

صحیح ہے، ہم وہ گیت نہ سن پائیں گے
مردے زمین کے نیچے چت پڑے ہوتے ہیں،
اور سیاہ شاخوں کی طرح گلے سڑتے رہتے ہیں
زمین کی تہ میں، گنگ، ناشنوا، بے بصر۔

جہاں تک میرے ہمسایوں کا تعلق ہے
مزدور عثمان اور شہید عائشہ کا،
جب تک وہ زندہ رہے
ایک شدید خواہش سے وابستہ رہے
شاید اسے جانے بغیر ہی

ساتھیو، اگر وہ دن دیکھنا میرے نصیب میں نہ ہو
جو روز بروز زیادہ ممکن نظر آتا ہے۔
مجھے اناطولیہ کے کسی گاؤں کے گورستان میں دفن کر دینا
اور اگر ممکن ہو سکے

میری قبر کے سرہانے ایک چنار کا درخت اگا دینا،
تب مجھے کسی کتبے وغیرہ کی خواہش نہ ہوگی۔

(باربیوا ہسپتال، ماسکو، ۲۷ اپریل ۱۹۵۳)

انگریزی سے ترجمہ: فاروق حسن

[یہ نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں اور جس مجموعے سے لی گئی ہیں اس کی اشاعتی تفصیل یہ ہیں: *Poems of Nazim Hikmet*, translated from the Turkish by Randy Blassing and Mutlu Konuk (New York: Persea Books, 1994). عنوان اور صفحوں کے اعداد، علی الترتیب، یہ ہیں: ”دل کا روگ“، *Angina Pectoris*، ۱۳۲؛ ”چند ہدایات ان کے لیے جنہیں جیل میں وقت کاٹنا ہو“، *Some Advice for Those Who Will*، ۱۳۸-۱۳۷؛ ”میرا جنازہ“، *My Funeral*، ۲۳۹؛ ”نویں سال گرہ“، *Nineth Anniversary*، ۱۰۹-۱۱۱؛ ”رستوراں کی خادمہ“، *Waitress*، ۲۰۷؛ ”تم“، *You*، ۱۵۰؛ اور ”وصیت نامہ“، *Last Will and Testament*، ۱۵۱-۱۵۲۔]